(Consciousness کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ اس کی اقتصادی ضروریات ہیں تو انسان کے نصب العینوں کی حیثیت کیا ہے اور ایسا کیوں ہے کہ انسان کے سارے اعمال و افعال اقتصادی ضروریات سے نہیں بلکہ نصب العینوں سے پیدا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کارل مارکس اور اس کا دوست اور فلسفۂ سوشلزم کی تخلیق کا شریک کار اینجلز دونوں اس حقیقت کی ایک عجیب و غریب وجہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دراصل تو اقتصادی ضروریات ہی انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ ہیں لیکن انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی اقتصادی ضروریات کے لیے نہیں بلکہ کسی نصب العین کے لیے جدّوجہد کر رہا ہے۔ یہ بات کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر چلا جا رہا ہو اور دیکھنے والوں کو ساتھ ساتھ یہ کہتا جائے کہ آپ یقین کیجیے میں درحقیقت پیدل چل رہا ہوں۔ آپ کو فقط ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اگر جو کچھ محسوس ہوتا ہے حقیقت وہ نہیں تو اس کا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے کہ حقیقت کچھ اور ہے، ورنہ جو کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کو حقیقت کیوں نہ سمجھا جائے۔ ذاتی احساس سے بڑھ کر کسی چیز کا ثبوت اور کیا ہوگا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب دنیا میں ہر آدمی کا احساس وہی ہو اور اس کلیہ کا استثناء ایک بھی موجود نہ ہو۔ ہر مشاہدہ بھی تو دیکھنے والے کے ذاتی احساس میں بدل کر ہی ایک حقیقت بنتا ہے۔ دراصل یہ حکماء اس قسم کا بے بنیاد دعویٰ کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تاریخ کا ہر مذہبی، علمی یا اخلاقی انقلاب درحقیقت ایک اقتصادی انقلاب تھا۔

مارکس لکھتا ہے:

"جس طرح سے کوئی شخص ایک فرد کے متعلق اس بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ اُس طرح سے کوئی شخص سماجی انقلاب کے ایک دَور کے متعلق اس بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ اس دَور کے لوگوں کا شعور (یعنی نصب العین) کیا ہے۔

اسی طرح سے اینجلز لکھتا ہے:

"نصب العین کی سوچ ایک ایسا عمل ہے جسے نام نہاد سوچنے والا لاریب شعوری طور پر انجام دیتا ہے، لیکن ایک کاذب شعور کے ساتھ۔ اُس کے عمل کو حرکت میں

لانے والی اصل قوتیں اس کے لیے نامعلوم رہتی ہیں۔ لہٰذا وہ عمل کی کاذبہ اور ظاہری قوتوں کا ہی تصور کرتا ہے۔ چونکہ اُس کا سارا عمل نصب العین کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصب العین پر مبنی ہے۔"

لیکن اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ جو شخص ایک اخلاقی یا مذہبی نصب العین کی جستجو کرتا ہے، اس کا یہ خیال کاذب ہوتا ہے کہ وہ ایسا کر رہا ہے اور درحقیقت وہ اپنی اقتصادی ضروریات کا اہتمام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک شخص کو دماغی طور پر صحت مند ہونے کے باوجود اپنی اقتصادی ضروریات کسی اخلاقی یا مذہبی نصب العین کے ایسے تقاضے نظر آتے ہیں جن کا اقتصادی ضروریات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ جن کی خاطر وہ اپنی اقتصادی ضروریات کو بلکہ اپنی زندگی کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ جب ایک شخص کو بھوک لگتی ہے تو وہ صاف کہتا ہے کہ اُسے خوراک کی ضرورت ہے اور یہ نہیں کہتا کہ اُسے مسجد میں جانے کی ضرورت ہے۔ لیکن جب وہ اپنی بھوک کا علاج کرنے کے لیے موجودہ اقتصادی حالات کو بدلنا چاہتا ہے تو وہ صاف طور پر اپنے مقصود کا ذکر کیوں نہیں کرتا، اور اس کی بجائے کسی اخلاقی یا مذہبی نصب العین کا ذکر کیوں کرتا ہے اور اس کی عقل پر ایسا پردہ کیوں پڑ جاتا ہے جو اُس کو بھلا دیتا ہے کہ وہ درحقیقت کیا چاہتا ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ اقتصادی تبدیلی کو برپا کرنے کے لیے ایک ٹیڑھا اور منافقانہ راستہ اختیار کر کے یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ فلاں مذہبی یا اخلاقی نصب العین کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ مارکس اور اینجلز کے خیال کے مطابق انسان فقط ایک اقتصادی وجود ہے اور ایک مذہبی یا اخلاقی وجود نہیں۔ اور اُس کے لیے سیدھا اور غیر منافقانہ راستہ اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں۔ جب انسان کی ساری خواہشات اقتصادی خواہشات ہیں تو وہ ظاہری طور پر لاشعوری طور پر یا منافقانہ طور پر بھی ایسی غیر حقیقی اور فرضی خواہشات کا بندہ کیوں بن جاتا ہے جو روحانی یا اخلاقی خواہشات کہلاتی ہیں اور جن کے مقابلہ میں وہ اقتصادی خواہشات کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اور پھر جب کسی شخص کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے کہ اُس کے عمل کے اصلی محرکات کیا ہیں تو مارکس اور اینجلز کو ان محرکات کا علم کیسے ہو گیا؟ اینجلز تسلیم کرتا ہے کہ انسان کا "سارا عمل نصب العین کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے۔" لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود وہ یہ نہیں مانتا کہ یہ عمل نصب العین پر مبنی ہے حالانکہ کسی دلیل کے بغیر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ وہ نصب العین کے ذریعہ سے اسی لیے انجام پاتا ہے کہ وہ درحقیقت اُس پر مبنی ہے۔

ایک قابلِ غور بات

یہ بات قابل غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے مشتملاتِ شعور یا ہمارے نصب العین (خواہ مارکسی انہیں اقتصادی حالات کی پیداوار یا اقتصادی ضروریات کی کاذب اور بگڑی ہوئی شکلیں ہی کیوں نہ سمجھیں) ہمیشہ حُسن، نیکی اور صداقت کے اوصاف کے اردگرد گھومتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ وہ ہر حالت میں ان ہی صفات سے حصہ لیتے ہیں اور جُوں جُوں اپنے آپ کے متعلق ہمارا علم ترقی کرتا جا رہا ہے وہ ان صفات سے اور قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم اقتصادی ناہمواریوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہوں تو پھر بھی ہم انصاف، انسدادِ ظلم، عدل، مساوات، اخوت، آزادی اور جمہوریت ایسے تصورات کا نام لیتے ہیں جو حُسن، نیکی اور صداقت اور خدا کی دوسری صفات سے ماخوذ ہیں اور حُسن کی تمنا خدا کی آرزو کا ایک عنصر ہے۔ ان اوصاف کی تمنا ہمارے تمام انقلابات کا مشترک پس منظر ہوتی ہے، خواہ یہ انقلابات اقتصادی ہوں یا اخلاقی یا مذہبی یا علمی یا سیاسی۔ کیا یہ حقیقت اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتی کہ حُسن، نیکی اور صداقت کی آرزو انسان کے شعور کی ایک مستقل خاصیت ہے جس کی تشفی کے لیے ہم وقتاً فوقتاً اپنے اقتصادی، اخلاقی، علمی اور سیاسی حالات کو بدلنے کے لیے جدّوجہد کرتے رہتے ہیں۔

مشتملاتِ شعور میں کارل مارکس نے عقل اور استدلال کو بھی شمار کیا ہے۔ چونکہ عقل بھی اقتصادی حالات کا نتیجہ ہے وہ صداقت کی جستجو کرنے کے لیے آزاد نہیں اور لہٰذا صداقت کو دریافت نہیں کر سکتی۔ یہ نقطۂ نظر سراسر غیر عقلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی یہ سمجھے کہ وہ گردوپیش کے اقتصادی حالات سے آزاد ہو کر عقلی استدلال کر رہا ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ وہ ایک وہم میں مبتلا ہے، لیکن اگر صداقت دریافت نہیں کی جا سکتی تو مارکس کے پیرو اپنے فلسفہ کو ایک صداقت کے طور پر کیوں پیش کرتے ہیں۔

مارکس اور اینجلز نے اپنے فلسفہ کی بنیاد عقلی استدلال پر رکھی ہے اور وہ عقلی استدلال ہی سے دوسروں کو قائل کرنا چاہتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر انسان کی عقل بھی وہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہے جو مروّجہ اقتصادی حالات مقرر کریں تو پھر اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اس قابل ہی ہو سکتی ہے کہ صداقت کی طرف راہنمائی کرے۔ اگر اشتراکیت کا فلسفہ بھی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے تو پھر نہ وہ عقل پر مبنی ہو سکتا ہے اور نہ درست۔ (جاری ہے)

لغات واعرابِ قرآن (۵۹)
پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ

آیت ۶۲

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۴۰ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۲

۲ : ۴۰ : ۱ اللغـــة

[اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا] "اِنَّ" حرف مشبہ بالفعل بمعنی "بے شک، یقیناً، تحقیق" ہے مزید چاہیں تو دیکھ لیجئے [۲ : ۵ : ۱] - "الَّذِيْنَ" اسم موصول بمعنی "وہ سب جو کہ" ہے۔ مزید وضاحت کے لیے چاہیں تو الفاتحہ : ۶ [۱ : ۶ : ۱ (۱)] دیکھئے۔ "اٰمنوا" کا مادہ "ا م ن" اور وزن اصلی "اَفْعَلُوْا" ہے۔ دراصل "أَأْمَنُوْا" تھا۔ مہموز کے قاعدہ تخفیف کے ماتحت اس کا "أَأْ" (ءَ۔ آ) میں بدل گیا۔ یہ اس مادہ سے بابِ افعال

کے فعل ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد اور خود اس باب (اِفعال) سے فعل "آمن یومن" ایمان لانا) کے معنی و استعمال پر البقرہ: ۳ [۲:۲:۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔

اس عبارت کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے"۔ "لوگ میں" وہ سب" کا مفہوم موجود ہے۔ بعض نے "ایمان لا چکے ہیں" سے ترجمہ کیا ہے جو عہد رسالت کے حوالے سے بلحاظ زمانہ درست ہے۔ بعض نے "مسلمان ہوئے/ہیں" سے ترجمہ کیا ہے۔ "مسلمان" "مسلم" ہی کی بگڑی ہوئی (اور فارسی ترکی اردو میں مستعمل) صورت لفظ ہے۔ لغت اور اصطلاح میں "ایمان" اور "اسلام" دو الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ تاہم عام مفہوم میں دونوں ہم معنی شمار ہوتے ہیں۔ بعض نے "الذین آمنوا" کا ترجمہ صرف "مسلمان" اور "ایمان والے" ہیں (بصورت جملہ اسمیہ) کیا ہے جو لفظ سے ہٹ کر ہے۔ اگرچہ بلحاظ مفہوم غلط نہیں ہے۔

۲:۴۰:۱(۱) [والذین ھادوا] "وَ" (اور) "الذین" (وہ لوگ جو کہ) ہے۔ یہاں "الذین" کی تکرار کی وجہ سے دوسرے "الذین" کے ترجمہ میں "بھی" لانا بہتر ہے یعنی "وہ بھی جو کہ" اگرچہ اکثر مترجمین نے "الذین" کا ہی دو دفعہ ترجمہ کرنا کافی سمجھا ہے۔

"ھادوا" کا مادہ "ھ و د" اور وزن اصلی "فَعَلُوا" ہے۔ یہ دراصل "هَوَدُوا" تھا جس میں واو متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل کر لکھی بولی جاتی ہے (مثل "قالوا") اس مادہ سے فعل مجرد "ھاد یھُودُ ھَوْدًا (باب نصر سے۔ مثل قال یقول) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "توبہ کرنا اور حق کی طرف مڑنا" ہیں۔ عموماً اس کے بعد "اِلیٰ" کا صلہ آتا ہے (جب یہ بتانا ہو کہ توبہ کے لیے کسی کی طرف مڑا) جیسا کہ "اِنَّا ھُدنا اِلیكَ" (الاعراف: ۵۶) میں آیا ہے۔

● اس فعل کے دوسرے مشہور معنی "یہودی ہونا" ہیں۔ اس استعمال کے لیے کسی صلہ کی ضرورت نہیں رہتی اور ان معنوں میں یہ فعل قرآن کریم میں دس جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی فعل کا مضارع "یھُود" معرف باللام (الیھُود) ہو کر معنیِ جمع پوری یہودی امت یعنی یہودی مذہب (یہودیت) کے پیروکاروں کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ بھی قرآن مجید میں آٹھ دفعہ آیا ہے۔ اور ایک یہودی کو عربی میں "یھودِیٌّ" کہتے ہیں (یہ لفظ بھی قرآن میں ایک دفعہ آیا ہے) اور "الیھود" یعنی جمع والے معنی (یہودیوں) کے لیے لفظ "ھُودٌ" بھی قرآن کریم میں تین بار استعمال ہوا ہے جو دراصل اس فعل مجرد "ھاد یھود" سے اسم الفاعل "ھائِد" (ھَاوِدٌ) کی جمع مکسر ہے۔ اور "ھُودٌ" ایک پیغمبر کا نام بھی ہے یہ بھی قرآن کریم میں سات جگہ وارد ہوا ہے۔

● اور بعض کے نزدیک فعل "ھاد" دراصل عبرانی لفظ ہے۔ تاہم اب یہ لفظ اور اس کے مشتقات (اسم فعل وغیرہ) اصل عربی کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔

اس طرح "والذین ھادوا" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "اور وہ بھی جو یہودی ہوئے"۔ جسے بعض نے صرف "یہودیوں" یا "یہودی" (یعنی جمع "مسلمان" کی طرح) ترجمہ کر دیا ہے جو بلحاظ مفہوم درست ہے۔

۲ : ۴۰ : ۱ (۲) [وَالنَّصٰرٰی] کی "و" برائے عطف (یعنی "اور") ہے اور لفظ "النَّصَارٰی" (برسم املائی) کا مادہ بظاہر "ن ص ر" اور وزن لام تعریف نکال کر "فَعَالٰی" بنتا ہے۔ جو عربی میں جمع مکسر کا ایک وزن ہے جیسے "نَدْمان" (پشیمان مرد/عورت) کی جمع "نَدَامٰی" آتی ہے۔ اس طرح گویا "نصاری" کا واحد "نَصْرَانٌ" (مذکر) یا "نَصْرَانَۃٌ" (مؤنث) ہے۔ جس سے مراد حضرت عیسیٰؑ سے منسوب مذہب کا پیروکار (مرد یا عورت) ہے (جسے ہمارے ہاں مسیحی یا عیسائی بھی کہتے ہیں)۔ مگر عربی میں یہ لفظ ہمیشہ یائے نسبت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں یعنی "نصرانیٌ" (مرد) اور "نصرانیۃ" (عورت)۔ "نصران" اور "نصرانۃ" استعمال نہیں ہوتے۔

● دراصل اس لفظ (نصاری) کا عربی مادہ "نصر" سے کوئی لغوی تعلق نہیں ہے اس مادہ (نصر) اور عربی کے بعض اوزان سے اس کی مناسبت محض اتفاقی بات ہے۔ اس لیے ڈکشنری میں یہ اسی مادہ کے تحت بیان ہوتے ہیں۔ اس لفظ (نصاری) کا واحد "نصرانیٌ" (بروزن اَغرابیٌّ) ہے اور اس کی اصل "الناصرۃ" ہے جو فلسطین کے شمالی علاقہ "جلیل" میں ایک قصبے کا نام ہے (عربی نقشوں میں آپ کو یہی نام نظر آئے گا مگر انگریزی اٹلسوں میں اسے "Nazareth" لکھا جاتا ہے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن اور ابتدائی عمر کا بیشتر حصہ اسی گاؤں میں گزرا تھا۔ اس لیے ان کے پیروکاروں کو "نصرانی" کہا جانے لگا جسے انگریزی میں Nazarene کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے لقب "المسیح" کی نسبت سے وہ "مسیحی" بھی کہلاتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ (مسیحؑ کسی شکل میں استعمال نہیں ہوا۔ اگرچہ لقب "المسیح" متعدد (۱۱) جگہ آیا ہے۔ لفظ "نصاریٰ" قرآن میں ۱۴ جگہ اور واحد منصوب کلمہ "نصرانیًا" صرف ایک جگہ آیا ہے۔

● نزول قرآن کے زمانے میں دین مسیح کے پیروکاروں کو اہل عرب "نصاریٰ" ہی کہتے تھے بلکہ وہ خود بھی "نصاریٰ" کہلاتے تھے جیسا کہ المائدہ: ۱۴ میں آیا ہے: "قالوا انّا نصاریٰ"۔ مسیحی کا لفظ عرب دنیا میں بھی مغرب سے آنے والے لفظ "کرسچین" (Christian) کے ترجمے کے طور پر رائج ہوا ہے۔ "المسیح" "Christ" کی عربی ہے اور "عیسائی" کا لفظ صرف برصغیر میں رائج ہوا ہے

یعنی مسیح کے نام "عیسیٰ" کی نسبت سے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں نصاریٰ کا ترجمہ بعض نے مسیحی اور عیسائی سے کر دیا ہے کیونکہ برصغیر میں یہی معروف لفظ ہے۔

۲:۴۰:۱(۳) [وَالصَّابِئِيْنَ] (یہ اس لفظ کا رسم املائی ہے اس کے رسم عثمانی پر آگے بحث "الرسم" میں بات ہوگی)۔ "واو عاطفہ" اور لام تعریف نکال کر لفظ "صابِئِين" نکلتا ہے جس کا مادہ "ص ب ء" اور وزن "فَاعِلِين" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "صبأ یَصْبَأُ صُبُوْءًا" (باب فتح سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں: "باہر نکل آنا" مثلاً کہتے ہیں "صبأ النجم" (ستارہ طلوع ہوا) اور "صبأ نابُ البعیرِ" (اونٹ کا دانت۔ کچلی۔ نکل آیا) پھر اس سے اس میں "ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف جانا" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور پھر اسی سے یہ "ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "صبأ الرجلُ" (آدمی نے اپنا مذہب بدل لیا) مکہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور مسلمان ہونے والے صحابہ کرامؓ کے لیے یہی فعل استعمال کرتے تھے۔ "مسلمان ہونا" (اسلم یُسلِمُ) یا "ایمان والا" (اٰمن یؤمن) کا فعل ان کے لیے کافر استعمال نہیں کرتے تھے۔ قرآن کریم میں اس مادہ (صبأ) سے کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا بلکہ اس سے مشتق صرف یہی لفظ "صابئین" (بصیغہ جمع الفاعل) معرف باللام شکل میں (مرفوع و منصوب) تین دفعہ آیا ہے۔

● "صابئون" (جس کا واحد فعل مجرد سے اسم الفاعل "صابِئٌ" ہے اور جس کی جمع مکسر "صابِئَة" بھی آتی ہے (اگرچہ قرآن کریم میں صیغہ واحد اور جمع مکسر کہیں استعمال نہیں ہوا) ایک مذہب کے پیروکاروں کو بھی کہا جاتا تھا۔ چونکہ یہ لوگ اپنی مذہبی تعلیمات بہت کم ظاہر کرتے تھے اس لیے اس کی حقیقت کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ وہ شاید "ستارہ پرست" بھی تھے اور غالباً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بھی نسبت رکھتے تھے۔ ان کے مذہب کے بارے میں اسی ابہام اور عدم معلومات کی بناء پر اہلِ عرب اور خصوصاً اہلِ مکہ لفظ "صابئ" کو "بے دین یا عجیب و غریب دین والا" کے معنی میں لیتے تھے۔

● قرآن کریم میں "صابئین" کا ذکر تین جگہ آیا ہے جن میں سے دو جگہ (البقرہ: ۶۲ اور المائدہ: ۶۹) تو ان کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ گویا اپنی اصل کے لحاظ سے یہ بھی کبھی (اپنی اصلی شکل میں) ایک دینِ برحق تھا۔ اور یہ بھی کہ صابئین بھی اس زمانے میں یہود و نصاریٰ کی طرح ایک معروف امت تھے۔ تیسری جگہ (الحج: ۱۷) میں ان کا ذکر اہلِ عرب کے لیے معروف مذاہبِ عالم میں سے ایک مذہب کے طور پر ہوا ہے۔

● "صابئین" کے مذہب کی حقیقت کے بارے میں مذکورہ بالا مقامات پر ہمارے مفسرین نے بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان کے بارے میں اس قسم کی تفاصیل ہمارے دائرۂ کار سے خارج ہیں۔ تاہم اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے بعض حوالوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں ان کے بارے میں زیادہ لکھا ہے۔ ہمارے زمانے کی جدید کتابوں میں سے عباس محمود العقاد کی کتاب "ابراہیم۔ ابوالانبیاء" میں بھی ان کے بارے میں عمدہ معلومات ملتی ہیں۔ "قاموس القرآن (للقرشی)" میں بعض قابلِ توجہ امور بیان ہوئے ہیں۔

● آج کل اس مذہب کے پیروکار، جو "صابئۃ" اور "مِندائیین" (واحد "مِندائِیّ") کہلاتے ہیں، ایران کے مغربی حصے میں اور جنوبی عراق کے مشرقی حصے میں یعنی دونوں ملکوں کے سرحدی علاقوں میں دریاؤں کے کنارے پائے جاتے ہیں۔ ان کی مذہبی رسومات میں بہتے دریا کا بڑا دخل ہے۔ ان کی کل آبادی پندرہ ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ ان کے بعض پڑھے لکھے لوگوں نے اپنے "صابئی" بچوں کے لیے دینی تعلیمات کے کتابچے بھی لکھے ہیں۔ عراق کے مشہور مجلہ "المورد" کے عدد (۲) ۱۹۷۶ء میں رشدی عُلیان کا ایک مقالہ "اصحاب الروحانیات أوِ الصابئۃ المِندائیّون" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ان لوگوں کے مذہب، اس کی تاریخ، ان کے عقائد و اعمال اور ان کی مخصوص (علیحدہ) دینی زبان کے بارے میں بہت عمدہ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں اور ان معلومات کے مصادر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ فمن شاء فلیراجعہ۔

● ہمارے مترجمین میں سے بیشتر نے تو "صابئین"، "فرقۂ صابئین"، "صابی لوگ" سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے "بے دین" اور بعض نے "ستارہ پرست" سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کی وجہ اوپر لغوی بحث میں بیان ہوئی ہے۔

[مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ] میں "مَن" موصولہ شرطیہ (بمعنی "جو کوئی بھی") ہے، چاہیں تو مزید وضاحت [۲:۲:۱(۱)، ۲:۷:۱(۴)] میں دیکھ لیجئے۔ "آمن" کے مادہ، باب فعل اور معانی پر البقرہ: ۳ میں بات ہو چکی ہے۔ "باللہ" کی "ب" تو فعل "آمن" کا صلہ ہے۔ اس طرح اس عبارت کا ترجمہ بنتا ہے "جو کوئی بھی ایمان لایا اللہ پر" مگر "مَنْ" کے شرطیہ ہونے کی وجہ سے فعل مستقبل میں بھی ترجمہ ہو سکتا ہے یعنی "ایمان لاتے یا لائے گا" کی صورت میں۔

[وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ] اس پوری ترکیب (وَ+ الیوم+ الآخر) کے کلمات پر البقرہ: ۸ [۲:۷:۱(۵)] میں بات ہو چکی ہے ویسے "وَ" کے لیے الفاتحہ: ۵ [۱:۴:۱(۳)] اور "الیوم" کے لیے الفاتحہ: ۴ [۱:۳:۱(۲)] اور کلمہ "الآخر" کے لیے البقرہ: ۴ [۲:۳:۱(۵)] کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ ترجمہ بنتا ہے "اور

آخری دن پر" (ایمان لائے) جسے "پچھلے دن" آخرت اور قیامت" سے بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ مفہوم سب کا ایک ہی بنتا ہے۔ تاہم بعض ترجمہ اصل الفاظ سے ہٹ کر ہے مثلاً "قیامت" سے ترجمہ کرنا۔

[وَعَمِلَ صَالِحًا] "وَ" عاطفہ ہے اور "عَمِلَ" کے مادہ، وزن باب فعل اور معنی وغیرہ البقرہ:۲۵ [۲:۱۸:۱(۲)] میں اور "صالحًا" کے مادہ وزن وغیرہ کی بحث البقرہ:۱۱ [۲:۹:۱(۶)] میں نیز البقرہ: ۲۵ [۲:۱۸:۱(۳)] میں دیکھئے۔ اس جملے کا ترجمہ بنتا ہے" اور اس نے کام کیا اچھا" جس کی بامحاورہ صورتیں" کام کیے نیک، اچھے کام کرتے رہے، اچھے کام کیے، نیک کام کرتے رہے، عمل نیک کرے گا، نیک عمل کرے" اختیار کی گئی ہیں بصیغہ جمع ترجمہ کرنے کی وجہ "مَنْ" ہے جو لفظاً واحد مگر بلحاظ معنی جمع ہے۔ اور کہیں ماضی کہیں مستقبل یا مضارع سے ترجمہ کی وجہ "مَنْ" میں شرط کا مفہوم یا اصل مستعمل فعل (ماضی) کا لحاظ ہے۔

[فَلَهُمْ] جو "فَ" (پس، تو پھر) + "ل" (کے لئے) + "هم" (ان) کا مرکب ہے یہ تمام کلمات کئی دفعہ گزر چکے ہیں۔ ترجمہ ہے" پس ان کے لیے ہے" جسے بعض نے معنی شرط کے جواب ہونے کی بنا پر" ہوگا" سے ترجمہ کیا ہے اور بعض نے "هُمْ" کا ترجمہ بھی اسی جواب شرط والے مفہوم کی بنا پر" ایسوں کے لیے، ایسے لوگوں کو" سے کیا ہے یعنی" جن کی صفات اوپر بیان ہوئی ہیں وہ لوگ" اور "لَهُمْ" کا ترجمہ" ان کو، ان کا" بھی ہو سکتا ہے۔

۲:۴۰:۱(۴) [اَجْرُهُمْ] میں آخری ضمیر مجرور "هم" بمعنی "ان کا/کی" ہے اور کلمہ "اَجْرٌ" کا (جو یہاں بوجہ اضافت خفیف آیا ہے) کا مادہ "ا ج ر" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد زیادہ تر باب نصر سے اور کبھی ضرب سے (أَجَرَ يَأْجِرُ أَجْرًا) آتا ہے اور اس کے متعدد معنی ہوتے ہیں: مثلاً

① "اجر یا بدلہ یا ثواب دینا" کہتے ہیں: "أَجَرَهُ اللّٰهُ" (علی ما فعل) یعنی اللہ نے اس کو اجر (ثواب) دیا (اس پر جو اس نے کیا)

② "کرایہ پر دینا اور کرایہ پر لینا" مثلاً کہتے ہیں: أَجَرَ الدَّارَ فلانًا ای "أكراه" یعنی "اس نے فلاں کو گھر کرایہ پر دیا" اور "أَجَرَ الدَّارَ من فلانٍ" ای "اِكْتَرَاه" یعنی "اس نے فلاں سے گھر کرایہ پر لیا" اور اسی معنی کے لیے یہ فعل باب افعال سے بھی آتا ہے یعنی "أَجَرَ الدَّارَ إِجَارًا" "اس نے گھر کرایہ پر لیا"

③ "کسی کے لیے اجرت پر کام کرنا" مثلاً کہتے ہیں: "أَجَرَ العَامِلُ صَاحِبَ العَمَلِ" یعنی "مزدور

(عامل) نے کام والے (صاحب العمل) کا کام اجرت پر کرنا منظور کر لیا یعنی وہ اس کا "اجیر" بن گیا۔ اور اسی معنی کے لیے باب مفاعلہ سے فعل "آجر یؤاجر مؤاجرۃ" (اجرت پر رکھنا۔ اجیر بنا لینا) بھی استعمال ہوتا ہے اور باب افعال سے "آجر یؤجر ایجارًا" "اجرت پر کام کرنا یا اجیر بننا" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا معانی کے علاوہ یہ فعل مجرد بعض دیگر معانی مثلاً ہڈی کا غلط جڑنا یا جوڑنا وغیرہ) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

● تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے صرف ایک ہی صیغہ فعل "تأجُرَ (نی)" صرف ایک جگہ (القصص: ۲۷) آیا ہے اور وہ بھی مذکورہ بالا صرف تیسرے معنی (۳) یعنی "کسی کے لیے اجرت پر کام کرنا" کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ مزید فیہ میں سے صرف باب استفعال کے دو صیغے قرآن کریم (القصص: ۲۶) میں آئے ہیں۔ ان تین صیغوں کے علاوہ اس مادہ سے قرآن میں کوئی اور فعل استعمال نہیں ہوا۔

● زیر مطالعہ لفظ "أجْر" اس مادہ کے فعل مجرد کا مصدر (بمعنی "اجرت دینا") بھی ہے اور بمعنی اسم المفعول (جو چیز بطور اجر یا اجرت دی جائے) بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو "اجر" دے وہ "آجر" ہے اور جس کو اجر دیا جائے وہ "مأجور" کہلاتا ہے اور جو چیز بطور اجرت دی جائے اسے "ماجور بہ" کہتے ہیں۔ اسی لیے عربی میں کہتے ہیں "أجَرَ بکذا" (اس نے اسے فلاں شے اجر میں دی) اور لفظ "اجر" (ماجور بہ ہونے کے لحاظ سے) متعدد معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً ثواب، اجر (یہ دونوں لفظ اردو میں بھی مستعمل ہیں) اور زیادہ تر "نیک عمل کی جزاء نیکی کا پھل، نیک کام کا اجر" کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں لفظ "اجر" ان معنی کے علاوہ مطلقاً اجرت، عوض، (عورت کا حق) مہر اور حق کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ بعض اہل لغت (مثلاً صاحب القاموس) نے "ثواب" اور "اجر" میں یہ باریک فرق بیان کیا ہے کہ "ثواب" صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے جب کہ "اجر" بندوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے گویا ہر "ثواب" اجر ہے مگر ہر اجر ثواب نہیں ہوتا۔

لفظ "اجر" (واحد جمع مفرد مرکب مختلف صورتوں میں) قرآن کریم کے اندر ۱۰۵ جگہ آیا ہے۔ زیر مطالعہ عبارت میں اس کا موزوں ترجمہ "ثواب، مزدوری، حق الخدمت، اجر اور صلہ" کی صورت میں ہو سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔

[عِنْدَ رَبِّهِمْ] جو "عِنْدَ" (ظرف بمعنی کے پاس، کے ہاں) + "ربّ" (رب پروردگار) +